Al-SHARQ
Vol: 03, Isue:02, July-Dec 2022, pp:110-121

OPEN ACCESS
Al-SHARQ
ISSN (Online): 2710-2475
ISSN (Print): 2710-3692
www.alsharqjr.com

امداد الفتاویٰ میں العادۃ محکمۃ سے استدلال کا منہج

The methodology of inference from "Al-Aadat al-Muhkamat" in "Imdad ul Fatawa"

Allah Wasaya
Ph.D Scholar, Gomal University.D.I Khan

Dr.Wahid Bakhsh,
Assistant Professor,Gomal University.D.I Khan

Submission: 28-09-2022 *Accepted: 28-10-2022* *Published:30-12-2022*

Abstract

In the history of Islam, the work and name of Islamic jurisprudence is very bright, radiant and valuable. If it is claimed that Islam is a perfect religion, it has complete instructions and guidance for every field and aspect of human life, then a question rises; what is the rationale behind this great claim? So, in answer to this question, we can present the entire jurisprudential effort and hard work of our jurists. In Islamic jurisprudence, the unique knowledge of the rules of jurisprudence is also a product of the thoughts and ideas of the jurists and Mujtahidin, which accomplishes the feat of explaining all the confusing jurisprudential issues and keeping them safe from the sand of time. With changing times new problems emerged and their solution were sought from the rules of jurisprudence and were narrated in Imdad-Ul-Fatawa. Among these rules is Al-Aadat-o- Mohakma. This paper describes the details of it.

***Key Words**: Al-Aadat-o- Mohakma, Imdad ul Fatawa, Inference*

صاحبِ امداد الفتاویٰ کا تعارف

نام و نسب: آپ کے دو نام تھے ایک ددھیالی نام اور ایک ننھیالی، ددھیال والوں نے آپ کا نام عبد الغنی رکھا جبکہ ننھیال کے خصوصی تعلقات مجذوب غلام مرتضیٰ کے ساتھ تھے انہوں نے آپ کا نام اشرف علی رکھا جو کہ بہت مشہور ہوا۔ [1] آپ ددھیال کی طرف سے فاروقی اور ننھیال کی طرف سے علوی تھے۔

CC BY

ولادت: آپ کی پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ بمطابق 19 ستمبر 1863ء ،بروز چہار شنبہ ،بوقتِ صبح صادق اپنے ننھیال کے مکان واقع محلّہ خیل تھانہ بھون ۔[2]

حصولِ علم

آپ نے قرآنِ کریم میرٹھ میں حافظ حسین علی صاحب مرحوم سے حفظ کیا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا فتح محمد صاحبؒ سے تھانہ بھون آکر پڑھیں اور اپنے ماموں سے فارسی کی انتہائی کتب ابوالفضل وغیرہ اس طرح پڑھیں کہ آپ کو فارسی میں پوری دستگاہ حاصل ہو گئی طالب علمی ہی کے زمانہ میں جبکہ آپکی عمر ابھی صرف اٹھارہ ۱۸ سال کی تھی آپ کو خارش کا مرض لاحق ہوا تو وطن تشریف لائے اور بطور مشغلہ اشعار پر مشتمل " مثنوی زیر و بم " تصنیف فرمائی جو آپ کی پہلی تصنیف ہے۔

ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ کے اواخر میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۰۱ھ کے شروع میں جبکہ آپ کی عمر صرف انیس یا بیس ۲۰ سال تھی اور چودھویں صدی ہجری کا آغاز ہو رہا تھا، آپ تحصیلِ علوم کی تکمیل کرکے افادۂ خلق کی صلاحیت پا چکے تھے، زمانہ طالب علمی میں طلباء حتیٰ کہ اعزہ تک سے الگ تھلگ رہتے۔ البتہ اسباق مطالعہ سے ذرا فرصت ملتی تو اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کی خدمت میں جا بیٹھتے۔ حتیٰ کہ آپ مدرسہ سے باہر اپنے رشتہ داروں سے بھی ملنے نہ جاتے تھے جن کا قیام دیوبند میں تھا وہ اکثر آپ سے تقاضا کرتے رہتے تھے کہ تم مدرسہ میں کیوں کھانا کھاتے ہو، یہاں کھالیا کرو، لیکن آپ نے اس کو منظور نہ کیا۔ آخر بہت اصرار پر اپنے والد صاحب کو لکھا کہ کیا کیا جائے تو انہوں نے خط لکھ بھیجا کہ تم وہاں رشتہ داریاں جتلانے گئے ہو یا طالب علمی کرنے۔ تب آپ نے بالکل سرے سے میل جول ہی ترک فرما دیا۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ جب طلباء کا امتحان لینے اور دستار بندی کے لئے تشریف لائے تو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کی ذہانت وذکاوت کی بطور خاص تعریف کی، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے آپ سے مشکل مشکل سوالات کئے، ان کے صحیح جوابات سُنکر مسرور ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ بحیثیت طالب علمی بھی آپ اپنے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، اس زمانہ میں بھی حاضر جوابی، ذہانت وفطانت اور منطق ومعقول میں کمال مہارت کا یہ عالم تھا کہ دیوبند میں جہاں کوئی غیر مذہب والا مناظرہ کرنے آتا۔ آپؒ فوراً پہنچ جاتے اور اس کو مغلوب کر دیتے، آپ کے استاذ مولانا سید احمد صاحب دہلوی نے سکندر نامہ کا امتحان لیا اور ایک شعر کا مطلب پوچھا تو چونکہ استاذ کا بتایا ہوا مطلب محفوظ نہ تھا، آپ نے اپنی طرف سے ایک مطلب بیان کیا، مولانا نے دریافت کیا کہ اور کوئی بھی مطلب ہو سکتا ہے آپ نے دوسرا مطلب بیان کر دیا۔ پھر دریافت فرمایا کہ اور کوئی مطلب بھی ہو سکتا ہے تو آپ نے تیسرا مطلب بیان کر دیا مولانا نے فرمایا کہ ان میں سے ایک مطلب بھی صحیح نہیں مگر تمہاری ذہانت پر نمبر دیتا ہوں، اس ذہانت اور استعداد کے باوجود اس پر فخر ومباہات تو کجا، تواضع کا یہ عالم تھا کہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ تحریر فرماتے ہیں آپ کی دستار بندی مولانا گنگوہیؒ کے ہاتھوں سے ۱۳۰۱ھ میں ہوئی اس سال دیوبند میں بڑا شاندار جلسۂ دستار بندی ہوا تھا۔ آپ اپنے ہم سبقوں کو لے کر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سند فراغ دی جائیگی حالانکہ ہم اس قابل ہر گز نہیں لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرما دیا جائے ورنہ مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی یہ سُنکر مولانا کو جوش آگیا اور فرمایا کہ "تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لئے ان کے سامنے تمھیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہئے باہر

جاؤگے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی، جہاں جاؤگے بس تم ہی ہوگے باقی سب میدان صاف ہے اطمینان رکھو"۔[3]

درس وتدریس

تکمیلِ تعلیم کے بعد والد اور اساتذہ کی اجازت سے آپ کانپور تشریف لے گئے اور مدرسہ فیضِ عام میں چودہ سال مسلسل درس تدریس، وعظ ونصیحت اور ارشاد و تلقین میں خدمات سرانجام دیں۔ یہاں سے مستعفی ہونے کے بعد کانپور کی جامع مسجد میں مدرسہ جامع العلوم کی بنیاد رکھی اور وطن واپسی تک اسی میں پڑھاتے رہے۔ آپ کا طرزِ تعلیم انتہائی عمدہ، آسان، سلیس اور نفیس تھا کہ انتہائی مشکل مقامات بھی سہل بنا دیتے تھے جو طالبعلم آپ سے جو اسباق پڑھ لیتا تھا پھر اس کو کسی دوسرے استاذ سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے "صدرا" کے مشہور مقام "مثناۃ بالتکریر" کو اتنے سہل انداز میں پیش کیا کہ طلباء حیران رہ گئے اور اس کی وجہ آپ خود ہی بیان کیا کرتے تھے کہ میں جب پڑھاتا تھا تو اپنے اوپر انتہائی تعب برداشت کرکے پہلے سے سبق کی تقریر کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیتا تھا پھر پڑھاتا تھا اس لئے میری ساری تقریر نہایت سہل اور باترتیب ہوتی تھی جس کی وجہ سے مشکل مقام بھی طالبعلموں کے لئے بالکل سہل ہو جاتے تھے اور باآسانی ذہن نشین ہو جاتے تھے گو مجھ کو تو سہل کرکے تقریر کرنے میں بہت تعب ہوتا تھا لیکن طلباء کو کسی مقام کے سمجھنے میں ذرا الجھن نہ ہوتی تھی۔[4] میں نے ضرورت سے زیادہ کبھی تقریر نہیں کی صرف حلِ کتاب پر اکتفا کیا کرتا زوائد سے کبھی طالبعلموں کے وقت کو ضائع نہ کیا اور میں اس کی تاکید اپنے ماتحت مدرسین کو بھی کرتا تھا اساتذہ زیادہ تر اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کے لئے نکات و دقائق کی تقریر کیا کرتے تھے جن سے کتاب کے اصل مطلب میں بھی خلط ہو جاتا تھا لیکن طلباء کا اصل نفع اس میں ہے کہ نفسِ کتاب کو اچھی طرح حل کردیا جائے کیونکہ استعداد اسی سے پیدا ہوتی ہے پھر نکات و دقائق خود ہی سمجھ آنا شروع ہو جاتے ہیں للذا استاذ کا اصل مطمح نظر یہی ہونا چاہیئے۔

آپ نے 1315ھ کے آخر تک پورے چودہ سال کانپور میں درس وتدریس، مواعظ ونصیحت اور ارشاد و تلقین کے ذریعے دینی خدمت انجام دی۔ کانپور والوں میں آپ کی محبت راسخ ہو چکی تھی جس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا "کانپور والوں نے میرے ساتھ ایسی محبت کا برتاؤ کیا کہ میں اپنے وطن کو بھی بھول گیا اور جتنا جی وہاں لگتا اتنا کہیں اور نہ لگتا اتنی محبت تھی کہ میں نے اپنے برتنوں پر اپنے نام کی بجائے کانپور کا لفظ کندہ کرایا تھا اب بھی جو ان برتنوں کو دیکھ لیتا ہوں کانپور یاد آجاتا ہے اگر حاجی صاحب کا ایماء نہ ہوتا ساری عمر کانپور نہ چھوڑتا اور سچ یہ ہے کہ مجھے جو اتنی شہرت ہوئی کانپور والوں کی وجہ سے ہوئی ورنہ میں اس درجہ کا شخص نہ تھا اور نہ ہوں۔

1315ھ میں کانپور چھوڑ کر آپ آبائی وطن تھانہ بھون تشریف لے گئے اور وہاں امداد اللہ مہاجر مکی کی خانقاہ کو نئے سرے سے آباد کیا اور مدرسہ اشرفیہ کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی جہاں آخر دم تک تدریس، تزکیۂ نفوس اور اصلاح معاشرہ جیسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

سلوک ومعرفت

ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد دل میں تزکیہ باطن کا داعیہ پیدا ہوا، چنانچہ 1201ھ میں جب آپ طلبِ علم کی تکمیل کے بعد کانپور میں اشاعت علوم میں مصروف تھے، سفر حج کی توفیق ہوئی، اپنے والد کی معیت میں زیارت حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ معظّمہ پہنچ کر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے حاجی صاحب آپ کے آنے سے بہت خوش

ہوئے اور دست بدست بیعت کی نعمت سے سرفراز کیا اور فرمایا تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ لیکن والد ماجد نے مفارقت کو گوارا نہ کیا۔ اس پر حاجی صاحب نے فرمایا کہ والد کی اطاعت مقدم ہے اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا، 1310ھ میں دوبارہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور چھ ماہ حاجی صاحب کی خدمت میں رہے۔ اس دوران میں حاجی صاحب نے ان کو شرفِ خلافت سے نوازا اور ساتھ یہ فرمایا میاں اشرف! توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا اگر سخت حالات پیش آئیں تو عجلت مت کرنا! ان وصیتوں اور باطنی دولت کو لے کر 1311ھ میں واپس وطن لوٹے اور حاجی صاحب کی وصیت کے مطابق تھانہ بھون میں رشد واصلاح باطنی کا کام شروع کیا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے لوگ پروانہ وار آتے رہے اور دین کی پیاس بجھاتے رہے۔[5]

اساتذہ کرام

مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا فتح محمد تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا سید احمد دہلوی۔

وفات

تھانویؒ کا انتقال رجب 1362ھ م 20 جولائی 1943ء کو 83 سال، 3 ماہ، 11 دن کی عمر میں ہوا۔ ان کی نماز جنازہ ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی

اور وہ تھانہ بھون کے قبرستان میں مدفون ہیں۔[6]

امداد الفتاویٰ کا تعارف

بقول مولانا تھانویؒ کے یہ مجموعہ ہے بعض فتاویٰ کا جو احقر نے وقتاً فوقتاً مختلف سوالات پر لکھے ہیں جس کے باعتبار احوال، تین حصے جدا جدا تھے۔

ا۔ایک وہ جو زمانہ طالب علمی میں دیوبند میں بامر اُستاذی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ لکھے گئے تھے اور جن پر مولانا یعقوب کی تصحیح بھی تھی اور یہ زمانہ ۱۳۰۱ھ تک کا ہے۔[7]

۲۔دوسرے وہ جو زمانہ مدرسی کانپور میں لکھے تھے اس وقت کسی محقق کی صحبت میسر نہ تھی اور عوام کی حالت کا تجربہ بھی کم تھا اور یہ وقت ۱۳۱۵ھ کے شروع کا ہے۔[8]

۳۔ تیسرے وہ جو قیامِ وطن میں لکھے ہیں ان میں کبھی صحبت مقدام المحققین مولانا رشید احمد گنگوہی سے مشرف ہوا تھا اور عوام کی حالت کا تجربہ بھی اضافۃً بڑھ گیا تھا ہر چند کہ ان تینوں حصّوں کی شان کا باہم ممتاز ہونا اس کو مقتضی تھا کہ تینوں علیحدہ رہتے مگر چونکہ اُن کی ترتیب بحسبِ حوادث تھی ابواب کی ترتیب پر مرتب نہ ہوئے تھے اور رغبت عام و سہولت تام ابواب بندی میں تھی اِس لئے اشاعت کے باعث ابواب میں مرتب کیا گیا اور زمانی ترتیب تاریخ سے معلوم ہو جائے گی جو اکثر جوابوں کے اخیر میں مرقوم ہے۔ اور تنگی نظر یا قلّتِ تجربہ سے جس جگہ کچھ کمی تھی اس کا تدارک نظر ثانی کرکے بقدرِ ضرورت کر دیا گیا اور سہولت کے لئے اس کو چار جلدوں میں منقسم کیا گیا۔[9]

حضرت تھانویؒ کی وفات ۱۳۶۲ھ میں ہوئی، ان کی وفات کے بعد مفتی محمد شفیعؒ نے دیوبند میں اشرف العلوم کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اس ادارے کا اصل مقصد مولانا تھانویؒ کی تصانیف کی اشاعت ہی تھا اور محنت شاقہ سے امداد الفتاوی قدیم

میں جو فتاویٰ شامل نہ ہوسکے اس میں امداد الفتاوی کے بہت سارے ضمیمیں یعنی اصلاح التسامح اور ترجیح الراجح اور تتمہائے امداد الفتاوی اور رسالہ الامداد اور رسالہ النور میں شائع شدہ فتاویٰ کو مفتی شفیعؒ نے جمع کرلیا اور جمع کرکے امداد الفتاویٰ جدید کی ترتیب دے کر مسودہ تیار کیا اور اسی زمانہ میں ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۹۴۸ء کو تقسیم ہند کے موقع پر فتاویٰ کا پورا مسودہ کراچی منتقل کرلیا اس کے بعد کراچی میں امداد الفتاویٰ کی ترتیب جدید قائم فرمائی اور ۶ جلدوں میں امداد الفتاویٰ جدید کے نام سے شائع کیا۔ پھر امداد الفتاویٰ جدید تحشیہ مفتی شبیر احمد قاسمی صدر مفتی جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد کی توجہ اور انتھک محنت سے ۱۲ جلدوں میں زکریا بک ڈپو دیوبند سے شائع ہوا ہے۔[10]

العادۃ محکمۃ کی وضاحت

اسلامی قانون کا ایک اہم مأخذ "عرف و عادت" ہے۔ جن امور کے متعلق نصوص موجود نہ ہوں اور کتاب و سنت نے صریح رہنمائی نہ کی ہو ان میں لوگوں کا تعامل اور عرف و عادت خاص اہمیت رکھتا ہے۔اور عرف و عادت کے تغیر سے احکام میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔ اسی کو علماء نے "العادۃ محکمۃ" اور " الثابت کالنص کالثابت کالعرف عرف و عادت سے ثابت بات گویا نص سے ثابت بات کی طرح ہوتی ہے" کہا ہے۔ چنانچہ کسی بھی کرنسی کی فقہی حیثیت متعین کرنے میں عرف و عادت کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔[11]

تحقیقی نظر سے دیکھا جائے تو عرف کوئی مستقل شرعی دلیل نہیں ہے، عموماً وہ مصلحت کی رعایت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ عرف کی رعایت شرعی نصوص کی تفسیر اور مطلق کی تقیید اور عام کی تخصیص تک کے لیے کی جاتی ہے اور عرف کی بناء پر کبھی قیاس کو بھی ترک کردیا جاتا ہے۔

عرف کے لغوی معنی

مادۂ عرف اصل میں دو امر پر دلالت کرتا ہے۔

١۔تتابع الشيء متصلًا بعضه ببعض ۔

کسی شئی کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا اس طور پر کہ ان میں سے بعض، بعض کے ساتھ متصل ہو۔

٢۔والسكون والطمأنينة۔[12]

سکون و طمانیت۔

عادت کے لغوی معنی

ہر وہ کام جس کے لوگ خوگر اور عادی ہو جائیں یہاں تک کہ وہ کام بغیر مشقت کے انجام دیا جانے لگے یا عادت اس حالت کا نام ہے جو ایک ہی نہج (طرز) پر بار بار ہو، جیسے حیض کی عادت۔[13]

عرف وعادت کی اصطلاحی تعریف

عرف کی تعریف علماءِ اصول ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

ما استقرت النفوس عليه بشهادة العقول وتلقته الطبائع بالقبول۔[14]

عرف وہ ہے جو ذہنوں میں راسخ ہو جائے اور جسے فطرتِ سلیمہ قبول کرلے، دوسرے لفظوں میں اسی مفہوم کو یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ "قولٌ یا" عملٌ کے اندر کسی قوم یا طبقہ کا ایسا تعامل عرف کہلاتا ہے جس کی عقلِ سلیم تائید کرے اور جسے فطرتِ

سلیمہ قبول کرتی ہو۔ [15]

العادة عبارة عما يستقرفي النفوس من الامورالمتكررة المقبولة عند الطبائع السليمة۔ [16]

عادت نام ہے ایسے امور کا جو مکرر ہوت رہتے ہوں اور طبائع سلیمہ اس کو قبول کر چکی ہوں۔

فقہاء کے نزدیک عرف و عادت ایک معنی میں استعمال ہوتا ہے، عرف کے ساتھ عادت کا لفظ بطور تاکید استعمال ہوتا ہے۔

فاختلف فی عطف العادة علی الاستعمال فقیل هما مترادفان وقیل المراد من الاستعمال نقل اللفظ من موضوعه الاصلی الی معناه المجازی شرعاً، وغلبة استعماله فیه ، ومن العادة نقله الی معناه المجازی عرفاً۔ [17]

عرف وہ امر ہے جو لوگوں میں عام ہو جائے اور لوگ اس پر عمل پیرا ہو جائیں خواہ وہ قول کے قبیل سے ہو یا فعل وترک کے قبیل سے ہو۔

عرف کی اقسام

اولاً عرف کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ عرفِ صحیح ۲۔ عرفِ فاسد

۱۔ عرفِ صحیح

وہ عرف ہے جو نصوصِ شارع کے معارض نہ ہو یا شریعت فی الجملہ اس کے معتبر ہونے کی شہادت دے رہی ہو اس صورت میں عمل دلیلِ شرعی پر ہوگا عرف محض مؤید ہوگا مثلاً اموالِ ربویہ (حنطہ، شعیر، ملح، تمر، ذہب، فضہ) کے علاوہ میں دیگر اموال کے کیلی یا مکیلی ہونے میں عرف کا معتبر ہونا۔ [18]

حکم

اس عرف کو اختیار کرنا اور اپنا لینا معتبر ہے چونکہ یہ اصولِ شرعی میں سے ایک اصل ہے۔

۲۔ عرف فاسد

وہ عرف ہے جس سے لوگ متعارف ہوں یعنی اس کا وہ عرف رہا ہو اور اس پر تعامل بھی رہا ہو لیکن وہ شریعت کے مخالف ہو اور قواعد شرع سے متصادم ہو۔ [19]

حکم

عرفِ فاسد کا کوئی اعتبار نہیں اور یہ متروک العمل ہے۔

عرف کے معتبر ہونے کی شرائط

عرف کے معتبر ہونے کے لیے فقہاءِ کرام نے درج ذیل شرائط ضروری قرار دی ہیں۔

۱۔ عرف عام ہو اور لوگ اس کا ہمیشہ لحاظ کرتے ہوں، ایسا تعامل جسے کبھی اختیار کیا جائے اور کبھی ترک کر دیا جاتا ہو وہ عرف شرعاً معتبر قرار نہیں پائے گا۔ [20]

۲۔ عرف کا انشاء تصرف کے ساتھ یا اس سے پہلے پایا جانا ضروری ہے مثلاً دو آدمیوں کے درمیان اگر کوئی معاملہ طے پائے اور ان میں نزاع کی شکل پیدا ہو جائے تو نزاع کے حل کے لیے اس عرف کا اعتبار ہوگا جو معاملہ کے شروع ہونے کے ساتھ یا اس سے پہلے لوگوں میں موجود تھا ایسا عرف جو بعد میں قائم ہو اس کو پہلے سے طے ہونے والے معاملہ میں فیصل نہیں مانا جائے گا چنانچہ فقہاءِ کرامؒ لکھتے ہیں کہ:

لاعبرة بالعرف الطارى والعرف الذى يحمل عليه الالفاظ انما هوالمقارن السابق دون المتأخر۔ [21]

بعد میں ظاہر ہونے والے عرف کا اعتبار نہیں ہے وہ عرف جس پر الفاظ کو محمول کیا جائے، اس کا عقد کے ساتھ یا پہلے ہونا ضروری ہے، بعد میں قائم ہونے والے عرف کا اعتبار نہیں ہوگا۔

مثال کے طور پر مہر کی ادائیگی میں تقدیم وتاخیر کا اگر ذکر عقدِ نکاح کے وقت نہ کیا جائے تو عرف کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا لیکن اگر لوگوں کا تعامل بدل جائے اور نکاح کے وقت جو عرف تھا وہ باقی نہ رہے تو نئے عرف کا اطلاق اس معاملہ پر نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی علاقہ میں گوشت سے صرف گائے کا گوشت مراد لیا جاتا ہو اور کسی شخص نے گوشت نہ کھانے کی قسم کھالی ہو تو اس کی قسم اسی وقت ٹوٹے گی جب وہ گائے کا گوشت کھائے گا کسی اور چیز کا گوشت کھانے سے وہ حانث نہیں ہوگا۔ [22]

۳۔ تصریح عرف کے خلاف نہ ہو، مثلاً رواج تو صرف آدھا مہر ادا کرنے کا ہو لیکن نکاح کے وقت عورت نے یہ شرط لگادی ہو کہ وہ پورا مہر معجّل لے گی اور شوہر نے اسے قبول بھی کرلیا ہو تو اب عرف کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ صراحتاً عقد میں جو بات طے ہوئی ہے اسی کا اعتبار ہوگا کیونکہ عرف کا سہارا لینے کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے، جہاں کسی معاملہ میں عاقدَین کا مقصد معلوم نہ ہو، تب سکوت اس بات کا قرینہ ہوا کرتا ہے کہ معاملہ عرف کے مطابق ہوا ہوگا لیکن جب تصریح عرف کے خلاف ہو تو پھر لاعبرة للدلالة فی مقابل التصریح والعرف یسقط اعتباره عند وجود التسمیة بخلافه۔ [23] صراحت کے مقابلہ میں دلالت کا اعتبار نہیں۔

۴۔ عرف کسی شرعی نص کے منافی اور اس کو معطل کرنے کا سبب نہ ہو کیونکہ ایسا عرف جو نصوصِ شریعت کے مقاصد اور اسکی روح کے خلاف ہو وہ عرف فاسد کہلاتا ہے اور شریعت میں اعتبار صرف عرف صالح کا ہے، مثلاً اگر شراب نوشی، قمار بازی، سودی کاروبار اور رقص وسرور کہیں کا عرف بن جائے، ضیافت میں حرام چیزوں کے پیش کرنے یا منگیتر کے ساتھ عقد سے پہلے ہی بے تکلف سیر و تفریح کا رواج ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس طرح کے عرف کا شریعت میں اعتبار نہیں بلکہ اس طرح کی چیزوں کی روک تھام اور معاشرہ کی ان امور میں اصلاح شریعت کا اولین مقصد ہوگا ورنہ تو تمام تر تکلیفی احکام ہی فوت ہو جائیں گے اور شریعت کا عملی زندگی سے یکسر خاتمہ ہو کر رہ جائے گا۔ [24]

۵۔ نیز یہ کہ عادت کے استعمال کا مکرر ہونا ضروری ہے اس حد تک کہ جب وہ لفظ بولا جائے تو بغیر کسی قرینہ کے وہی معنی سمجھ میں آئے جو معنی اس کی طرف منقول ہے اور فہم کسی اور معنی کے بجائے اس معنی کی طرف سبقت کرے اسی لیے کلبِ معلّم اسی کلب کو کہا جاتا ہے جب مالک کلب کو تین مرتبہ شکار پر چھوڑے اور تینوں مرتبہ شکار کو پکڑ کر مالک کے لیے چھوڑ دے خود نہ کھائے، اسی طرح جب اسے شکار پر چھوڑا جائے اور کسی وجہ سے اسے راستے سے واپس بلانا ہو اور وہ بلائے تو واپس بھی آجائے تو کہا جائے گا کہ شکار کو نہ کھانے کی کتے کی عادت ہو گئی ہے اور اب یہ کتا کلبِ معلم کہلائیگا۔ [25]

۶۔ چھٹی شرط یہ ہے کہ عادت مطّرد ہو یا غالب ہو، یعنی لوگوں کا کسی عمل کو بار بار، مسلسل کرنے کی عادت ہو یا غالب

معنی پر محمول کرنے کی عادت ہو، جیسے اگر کسی نے دراہم یا دنانیر کے بدلے فروخت کیا اور متبایعان کسی ایسے شہر میں رہتے ہیں، جہاں مختلف نقود رائج ہوں اور ہر ایک کی مالیت بھی الگ الگ ہوں اور رواج میں بھی اختلاف ہو، کسی کا زیادہ کسی کا کم رواج ہو تو بیع غالب نقدِ بلد کی طرف لوٹے گی یعنی جس کے کا رواج زیادہ ہو وہی مشتری کو ادا کرنا پڑے گا۔ [26]

امداد الفتاویٰ میں العادۃ محکمۃ سے استدلال کا منہج

۱۔ قاعدہ ہذا کی فقہی عبارات پر تطبیق

کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ کوئی فقہی عبارت لاتے ہیں اور پھر اس عبارت پر قاعدہ کو منطبق کرتے ہیں جس سے کسی جدید مسئلے کا باآسانی مل جاتا ہے اور کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ مثلاً

سوال: مسجد کے سامنے راستے کے متصل افتادہ زمین بعض اہلِ محلّہ مسجد میں شامل کرنا چاہتے ہیں اگر کمیٹی سے اجازت لے لیں تو کیا مسجد میں شامل کرنا جائز ہوگا یا نہیں۔

الجواب :فی الدرالمختار جعل الشیء من الطریق مسجداً لضیقه ولم یضر بالمارین جاز۔۔۔۔۔۔۔۔ [27]

فرمایا: ان روایات سے معلوم ہوا کہ طریق عام بادشاہِ وقت کا مملوک نہیں حقِ عامہ ہے۔ کمیٹی کی اجازت صرف مصلحتاً ہے ان کا مملوک ہونے کی وجہ سے نہیں، اور حدیث میں جو سبع اذرع کا لفظ آیا ہے وہ تحدید کے لئے نہیں بلکہ اس وقت اس سے حاجت مرتفع ہو جاتی تھی۔ [28]

اس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ حکم حاجت وضرورت اور عرف و عادت پر لاگو ہوتا ہے اور عرف کے بدلنے سے حاجات بدل جاتی ہیں اس لئے احکام بھی بدل جائیں گے۔

۲۔ فتویٰ کی بناء فقط قاعدہ فقہیہ

سوال: خادم کے ذریعے ہاتھ کا پنکھا بحالتِ نماز بغرض راحت مصلیین جائز ہے یا نہیں اگر جائز نہیں حالانکہ مثل شامیانے، قندیل اور قالین کے ہے پھر ان کی اجازت اور ان کا عدمِ جواز وجہ فرق کیا ہو سکتا ہے۔؟

جواب: مسجد درحقیقت ایک دربار شاہنشاہِ خداوندی ہے اور اس میں نماز پڑھنا حاضری دربارِ شاہی ہے جیسے درباروں میں حاضر ہو کر بادشاہ کے آداب وسلام بجالائے جاتے ہیں اور آکر اظہارِ بندگی وپرستندگی کرتے ہیں اسی طرح مسجد میں حاضر ہونے سے یہی مقصود ہے کہ خداوند عالم کے روبرو دست بستہ کھڑے ہو کر اپنی عبودیت کا اظہار کریں حقیقت نماز کی یہی ہے اور اسی وجہ سے اس میں خشوع و خضوع پر نظر ہے جس قدر خشوع و خضوع بجالائے گا اسی قدر اس کی بندگی پسند آئے گی جب یہ معلوم ہو چکا کہ مسجد ایک دربار ہے اور اس کے حاضرین درباری ہیں تو اب سمجھنا چاہیئے کہ دربار کی رونق وعلو کو کوئی مکروہ وغیر مستحسن نہیں سمجھتا اور نہ درباریوں کی زیب وزینت کو کوئی مذموم و قبیح سمجھتا ہے مگر جو درباری صورت فخر کی اختیار کرے وہ منافی علتِ غائی یعنی بندگی کے ہے اس لئے قبیح ہوگی۔ اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ کون سی چیز زیب وزینت کا باعث ہے اور کون سی چیز فخر و تکبر کا باعث پس وہ چیز جو مستحسن ہو جائز ہوگی اور جو باعثِ تکبر ہو وہ ناجائز ہوگی یقیناً شامیانے اور قندیل وغیرہ مستحسن سمجھے جاتے ہیں اس لئے جائز ہوں گے جبکہ نمازی پر خادم کا پنکھا جھلنا کس قدر نازیبا اور دربارِ شاہی کے خلاف ہے کہ کہنے کو تو اظہارِ بندگی ہے لیکن صورت فاخرانہ ہے اس لئے ناجائز ہوگی۔ [29]

مولانا تھانوی کا جواب قاعدہ فقہیہ العادۃ محکمۃ پر مبنی ہے آپ نے مسجد کو دربار پر قیاس کیا اور دونوں درباروں میں آنے والوں کے مقاصد کو یکساں قرار دیا اور وہ اظہارِ بندگی واطاعت ہے جب دونوں مواقع پر آنے والے غلام اور تابعدار کی حیثیت سے آتے ہیں تو پھر ہر دو، ایک دوسرے سے کیسے جدا ہو سکتے ہیں اور یہ مسلّمہ اصول ہے کہ غلام کی وہ حاضری معتبر سمجھی جاتی ہے جس میں عجز وانکساری کے ساتھ حاضر ہو اور اگر وہ متفاخرانہ انداز سے آئے تو وہ بجائے عنایت کے موردِ عتاب ٹھہرتا ہے پس اگر کوئی تابعدار کسی دنیاوی دربار میں اپنا خادم و نوکر ساتھ لائے اور وہ نوکر ہاتھ میں پنکھا لئے افسر کے ساتھ ساتھ چلے تو اس کو برا تصور کیا جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح اگر کوئی دربارِ الٰہی میں اسی انداز سے حاضر ہو تو اس کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جائے گا کیونکہ العادۃ محکمۃ یعنی عادات پختہ اصول بن چکی ہیں، اس اصول کی مخالفت جیسے عرفاً قبیح سمجھی جاتی ہے اسی طرح شرعاً بھی قبیح سمجھی جائے گی۔

۳۔ عرف کے تعدد پر احکام کے تعدد کا اثبات

سوال: کابل کے امیر اور ان کے تمام متعلقین جوتوں سمیت مسجد میں آئے اور نماز ادا کی، درست ہے۔؟

جواب: اس مقام پر تین امور ہیں۔

اول: اگر نعال (جوتا، بوٹ) طاہر ہوں تو ان کے پہنے ہوئے مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا فی نفسہ قطع نظر عوارضِ خارجیہ کے جائز ہے۔

دوم: اگر نعال نجس ہوں تو ان کو پہنے ہوئے مسجد میں آنا اور ان کے ساتھ نماز پڑھنا ناجائز و معصیت ہے۔

سوم: مسجد و نماز دونوں چیزیں واجب الاحترام وادب ہیں اور ادب کے بعض طرق عرف پر مبنی ہوتے ہیں پس جس ملک میں مع النعال کسی کے فرش پر آنا اور اس سے ملنا عرفاً خلافِ ادب سمجھا جاتا ہو وہاں صلوۃ اور دخول مسجد مع النعال اس عارض بے ادبی کی وجہ سے واجب المنع ہوگا قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طویٰ۔[30] خواہ نعال طاہر ہوں یا نجس، چونکہ اس کا مدار ادب و عرف پر ہے جہاں خلافِ ادب سمجھے جاتے ہوں وہاں یہ حکم جوتے کے نجس ہونے پر محمول ہوگا اور جہاں خلافِ ادب نہ سمجھے جاتے ہوں وہاں گنجائش ہوگی۔ اس تقریر کی بناء پر دیارِ ہند کا عرف ظاہر ہے کہ جوتے کو خلافِ ادب سمجھا جاتا ہے اس لئے منع کیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ اہلِ کابل کا عرف ویسا ہی ہو اس لئے جائز ہوگا۔[31]

مولانا تھانوی نے جواز و عدمِ جواز کا معیار عرف و عادت کو قرار دیا اور اس میں قاعدہ فقہیہ یعنی العادۃ محکمۃ ہی کارفرما ہے اسی قاعدہ کلیہ کی بناء پر حکم وارد ہوا ہے چونکہ قواعدِ فقہیہ بھی کسی کی دلیل بن سکتے ہیں اس لئے مزید دلائل کو بیان نہیں کیا گیا۔

۴۔ عرف کے عموم سے حکم اخذ کرنا

سوال: ایک طالبعلم نے مسجد کے صحن میں چارپائی بچھائی جہاں لوگ وضو کرتے ہیں اور کسی نے اعتراض کیا کسی معذوری کی وجہ سے ایسا کرنا جائز ہوگا۔؟

جواب: فی نفسہ جائز ہے اگر پاک ہو مگر چونکہ عرفاً خلافِ ادب ہے اس لئے مناسب نہیں جیسے جوتہ پہن کر مسجد کے اندر چلا جانا۔[32]

آپ نے عرف کے عموم سے استدلال کیا یعنی عرفاً اس کو غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے اس لئے شرعاً بھی غیر مستحسن ہوگا بندوں کسی دلیلِ تفصیلی کے محض قواعد پر ہی حکم کو مبنی رکھا۔ یعنی عادت یہی ہے کہ لوگ مسجد میں جوتے پہننے کو بے ادبی

گردانتے ہیں جبکہ جوتا پہننے میں بظاہر کوئی ضرورت بھی نہیں اس لئے بھی جوتا پہننا قبیح متصور ہوتا ہے کیونکہ عبادت خانے میں فضول اشیاء کا ہونا بے توجہی کا سبب بن سکتے ہیں، لیکن چارپائی اس کے برعکس ہے کہ اس میں من وجہ ضرورت ہے اور وہ استراحت حاصل کرنا لیکن اس میں عرفاً دوسری جہت بھی پائی جاتی ہے اور وہ ہے بے ادبی یا اس کا شائبہ، جس کی وجہ سے اس کو بھی افعالِ ممنوعہ میں شمار کیا گیا کیونکہ العادۃ محکمۃ یعنی امور کا حسن وقبح عرف وعادت سے طے کیا جاتا ہے۔

۵۔قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ اور عباراتِ فقہیہ یعنی دلائل ذکر نہ کرتے ہوئے حکم بیان کرنا

سوال: مغرب وعشاء کے مابین اندرون مسجد چراغ روشن رکھنا اگرچہ نمازیوں کی آمدورفت نہ ہو کیا ضروری ہے یعنی چراغ جلانا نمازیوں کی سہولت کے لئے یا فی نفسہ مسجد کی کوئی تعظیم ہے۔؟

جواب: یہ وقت ایسا ہے کہ کسی کا مسجد میں آجانا تلاوت کے لئے یا نوافل کے لئے بعید نہیں بعضے آبھی جاتے ہیں نیز مسجد کی اس میں حفاظت بھی ہے کہ کوئی جانور وغیرہ آجاوے تو دیکھ کر دفع کیا جاوے بلکہ روشنی میں آتے بھی کم ہیں اس لئے بلا نکیر ایسے وقت میں مساجد میں روشنی رہنا شائع ومعتاد ہے۔ [33]

کسی دلیلِ شرعی کا حوالہ دیئے بغیر حضرت تھانوی نے فتویٰ صادر کیا جو کہ قاعدہ فقہیہ العادۃ محکمۃ پر بناء کرتا ہے دراصل ایسے مسائل کسی آیت، حدیث یا قولِ صحابی میں صراحتاً نہیں پائے جاتے بلکہ عموماً ان کا مدار قواعد ہی پر ہوتا ہے البتہ یہ قواعد کسی آیت، حدیث یا اجماع سے اخذ شدہ ہوتے ہیں۔ عرف

وعادت یہی ہے کہ لوگ مغرب کے بعد گھروں میں روشنی کا انتظام کرتے ہیں تاکہ کسی موذی جانور سے حفاظت رہے نیز چلنے پھرنے میں سہولت، یہی ضرورت مسجد میں بھی پائی جاتی ہے اس طرح کہ اس وقت بھی کوئی نہ کوئی عبادت کی نیت سے مسجد آجاتا ہے اور موذی جانور جس طرح گھروں میں ہوتے ہیں اسی طرح مساجد میں بھی آجاتے ہیں جو ممکنہ تکلیف کا باعث بن سکتے ہیں نیز نقل وحرکت کے لئے بھی روشنی کا ہونا ضروری ہے، مزید یہ کہ اس احتیاج کے بدوں لوگ مساجد میں روشنی کا انتظام کئے رکھتے ہیں یہی عادت ہے اس لئے آپ نے عادت کے معتاد ومروج ہونے کی وجہ سے اس کی اجازت کا فتویٰ دیا۔

۶۔عرف کے بدلنے سے شرعی حکم میں اجتہاد

سوال: عمرو، زید کی زمین پندرہ من غلہ فی بیگہ کے حساب سے کاشت کرتا ہے باقی غلہ خود لے لیتا ہے زید اس غلہ سے دو روپیہ دوآنہ فی بیگہ سرکار کو دیتا ہے زید اس غلہ سے زکوۃ کیسے ادا کرے؟

جواب: فی الدر المختار والعشر علی الموجر کخراج مؤظف وقالا علی المستاجر کمستعیر مسلم وفی الحاوی وبقولهما ناخذ قلت ولکن افتی بقول الامام۔۔۔ [34]

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر موجر پوری اجرت لے اور مستاجر کے پاس بہت کم بچے تو عشر موجر کے ذمہ ہے اور اگر موجر اجرت کم لے اور مستاجر کے پاس زیادہ بچے تو مستاجر کے ذمہ ہے۔ چونکہ ہمارے دیار میں اجرت کم لی جاتی ہے اسی لئے میں وجوب عشر علی المستاجر پر فتویٰ دیا کرتا ہوں ہاں اگر کسی جگہ اجرت پوری لی جاوے جس میں زمیندار عشر بخوبی ادا کرسکتا ہو تو اس وقت وجوب عشر علی الموجر پر فتویٰ ہوگا، صورتِ مسؤلہ میں اجرت اور پیداوار کی نسبت معلوم نہیں اس لئے حکم میں تعیین نہیں کی جاسکتی۔ [35]

مولانا تھانویؒ نے در مختار کی عبارت کو پیش کرنے کے بعد حکم کو عرف پر دائر کیا یعنی زکوۃ کا مدار دراصل آمدنی پر ہے

اگر زمین ایک ہاتھ میں ہوتی تو زکوٰۃ بھی اسی کے ذمے ہوتی لیکن جب زمین کرایے پر اٹھالی گئی تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ عرف کا طریقہ کار کیا ہے عرفاً اگر زمین کا کرایہ بہت زیادہ لیا جاتا ہو اور مستاجر ضروریات گھاس واناج کے حصول کے لئے لینے پر مجبور ہو تو زکوٰۃ موجر کے ذمہ ہو گی، اگر معاملہ بر عکس ہو مثلاً موجر کاشت کرنا نہیں جانتا اور اس نے معمولی و مناسب کرایے پر زمین دے دی یا عرف نے زمینوں کے کم کرایے طے کئے ہیں اور زیادہ بچت کا مالک مستاجر رہتا ہے تو اس صورت میں زکوٰۃ مستاجر کے ذمہ ہو گی یعنی عشر علی التعیین کسی ایک کی ذمہ داری نہیں بلکہ ہر دور میں مختلف ہو سکتا ہے نیز یہ کہ اگر کوئی عرف سے علیحدہ جدا ہو کر معاملہ کرتا ہے تو حکم کا مدار اس خاص جزئی میں ان کے طے شدہ تناسب اور اجرت پر ہوگا جیسا کہ حضرت تھانوی نے اس مسئلہ میں فرمایا کہ اجرت اور پیداوار معلوم نہیں اس لئے حکم نہیں بتایا جاسکتا یعنی اگر دونوں کے حصص معلوم ہوتے تو اسی کے مطابق فتویٰ دیا جاتا معلوم ہوا کہ سائل کے حالات کے مطابق حکم صادر ہوتا ہے محض عرف بھی کافی نہیں بالخصوص جب کوئی جزئی عرف سے مستثنیٰ ہو یا عرف سے ٹکرا رہی ہو۔

۷۔ جزئیات کا حدوث اور دلائلِ اصولیہ کا سکوت

سوال: مسجد کی زمین میں کچھ میوہ جات کے درخت ہیں جن کے پھل مسجد کے نمازیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں تو یہ تقسیم کر دینا جائز ہے کہ نہیں یا فروخت کرکے مسجد کے اخراجات میں صرف کرنا ضروری ہے۔؟

جواب: اگر درخت لگانے والے کی نیت معلوم ہو تو اس کے موافق حکم ہوگا اور اگر کچھ معلوم نہ ہو تو بوجہ عرف کے نمازیوں میں تقسیم کر دینا درست ہے۔[36]

مذکورہ مسئلہ میں کسی دلیلِ اصولی کی بناء پر نمازیوں میں میوہ کے تقسیم کو جائز نہیں کہا گیا بلکہ عرف کی بناء پر جواز کا حکم دیا گیا اس وقت یہی عرف چل رہا تھا کہ لوگ مسجد کے درختوں سے میوہ توڑ لیتے تھے اس لئے آپ نے بھی شرعاً یہی فتوی صادر فرمایا حالانکہ اس کے متعلق کوئی شرعی دلیل وارد نہیں، یہ آپ کی فقاہت کا نتیجہ ہے کہ آپ نے نئے مسائل کا جواب اجتہاد کے ذریعے احسن انداز میں دیا اور ان کا متدل قواعدِ فقہیہ کو بنایا اور مزید یہ کہ اجتہاد کے باب کو مقفل نہیں کیا بلکہ یہ باب مفتوح ہے اور عرف و عادت سے احکام کا استنباط اگلے ادوار کے علماءِ محققین کے سپرد کر دیا گیا ۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات (References)

[1]۔ منشی عبدالرحمان خان، سیرتِ اشرف، ج1، ص54، ناشر ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان، 1956ء
[2]۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب، اشرف السوانح، ج1، ص19، نیو اسلامی آرٹ پریس ملتان، س ن۔
[3]۔ ایضاً، ج1، ص31تا32
[4]۔ ایضاً، ص49
[5]۔ منشی عبدالرحمٰن خان، سیرتِ اشرف، ص85 ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان ستمبر 1956ء
[6]۔ ایضاً، ج2، ص436

[7]۔اشرف علی تھانوی، الحسن تھانوی نمبر، ص243، العالمین پریس لاہور، اکتوبر 1987ء

[8]۔امداد الفتاویٰ جدید مطول حاشیہ، ج1، ص40، زکریا بک ڈپو انڈیا، س ن۔

[9]۔ایضاً

[10]. urduleaks.com

[11]۔alwaqiamagzine.wordpress.com. اسلام کا نظریہ زر اور کرنسی کی حقیقت

[12]۔ مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی، ج5، ص2635، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، طبع ثانیہ 2005ء

[13]۔ابراہیم انیس عبد الحلیم منتصر، المعجم الوسیط، ج2، ص535، ناشر مجمع اللغۃ العربیہ، طبع چہارم 2004ء

[14]۔علی بن محمد بن علی الجرجانی، کتاب التعریفات، ج1، ص149، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۳ھ

[15]۔شامی، محمد امین ابن عابدین، مجموعہ رسائل عابدین، ج2، ص114، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان 1971ء

[16]۔زین الدین بن ابرٰہیم بن نجیم الحنفی، الاشباہ والنظائر، ج1، ص79، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ

[17]۔ایضاً

[18]۔ رحمانی، جعفر علی مفتی، الاصول والقواعد للفقہ الاسلامی، ص205، طبع سوم، مکتبہ السلام اکل کوا، 2014ء

[19]۔ محمد بن صالح، عثیمین، مترجم افضل سہیل، القواعد الفقہیہ، ص118، دار الابلاغ اردو بازار لاہور، 2019ء

[20]۔ قاسمی، نعمت اللہ، عرف وعادت، ص421، ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی، فروری 2013ء

[21]۔زین الدین بن ابرٰہیم بن نجیم الحنفی، الاشباہ والنظائر، ج1، ص101، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ

[22]۔شامی، ابن عابدین، رد المحتار، ج3، ص91، مکتبہ زکریا دیوبند یوپی انڈیا، س ن

[23]۔ رحمانی، جعفر علی مفتی، الاصول والقواعد للفقہ الاسلامی، ص205، طبع سوم، مکتبہ السلام اکل کوا، 2014ء

[24]۔ابو الحسن علی قاسمی، عرف وعادت، 197، ایفاء پبلشرز، فروری 2013ء

[25]. Tafseer-e-Baghwi-5:4-eQuran Library

[26]۔ محبوب علی وجہی، عرف وعادت، ص300، ایفا پبلیکیشنز، فروری 2013ء

[27]۔الدر المختار مع الشامی، ج6، ص574، مکتبہ زکریا دیوبند یوپی انڈیا، س ن

[28]۔ مولانا اشرف علی تھانوی، امداد الفتاویٰ، ج4، ص664، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید، جولائی 2010ء

[29]۔ایضاً، ج4، ص685

[30]۔سورہ طٰہٰ: ۳۹

[31]۔ مولانا اشرف علی تھانوی، امداد الفتاویٰ، ج2، ص702، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید، جولائی 2010ء

[32]۔ایضاً، ج2، ص797

[33]۔ایضاً، ج2، ص691

[34]۔الدر المختار مع رد المحتار، ج4، ص62، مکتبہ زکریا دیوبند ،

[35]۔ مولانا اشرف علی تھانوی، امداد الفتاویٰ، ج2، ص89، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید، جولائی 2010ء

[36]۔ایضاً، ج2، ص594